ڈاکٹر واثق الخیر
Managing Editor, Tareek e Adab e Urdu, Delhi

پریم چند کے ناولوں میں بیسویں صدی کا ہندوستانی سماج

بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہندوستان کے لوگوں کے لیے رد و قبول، کشمکش، اضطراب اور انفرادی و اجتماعی شعور کی آزادی کا زمانہ تھا۔ نئی نسل جدید علوم، نئے خیالات اور نئی تہذیبی و سماجی تبدیلیوں سے روشناس بھی تھی اور انہیں قبول کرنے پر آمادہ بھی۔ اس صدی کے ابتدا میں پرانی روایات بھی خاصی حد تک مضبوط تھی۔ جدید تعلیم، مغربی اثرات، بدلتے ہوئے اقتصادی حالات اور مادی ذہنیت کی وجہ سے بیسویں صدی میں اس روایت کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ شمیم حنفی نے بیسویں صدی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ایسا لگتا ہے کہ یہ صدی ہوش مندی اور دیوانگی کے دوراہے پر ایک ساتھ چلتی رہی ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کے مستقبل بعید کے مؤرخ نے اسے نام دیا تھا پریشان خیالی کے عہد کا، آڈن کے نزدیک یہ ''بے چینی کا عہد'' ہے۔ کونسلر کے لفظوں میں ''تمنا کا عہد''۔ فرانز الیگزینڈر کے لفظوں میں ''عدم تعقل کا عہد''۔ سوروکن نے کہا کہ یہ ''بحران کا عہد'' ہے تو کارل مینہیم نے اسے ''تعمیر نو کا عہد'' کا نام دیا۔۔۔ البتہ مارٹن وہائٹ ہیڈ کا یہ کہنا کہ بیسویں صدی ''تجربے کا عہد'' ہے، دل کو لگتا ہے۔''(1)

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ صدی مسلسل جدلیات کی صدی ہے۔ روحانیت اور مادہ پرستی، تعقل پرستی اور عقل بیزاری، آزادی و غلامی اور جنگ و امن کی صدی ہے۔ انسانی تاریخ میں بیسویں صدی اپنی ایک الگ حیثیت اور انفرادیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس صدی میں جو عظیم ترین انقلابات رونما ہوئے وہ انسانی عظمت اور قدرت کے مظہر ہیں۔ اس صدی کے آغاز میں ہی حیرت انگیز ایجادات نے فطرت کو تسخیر کر کے انسانی قوت و عظمت کے جھنڈے نہ صرف اس زمین پر بلکہ خلا اور کائنات میں بھی

گاڑ دیے۔انسانی زندگی میں اس سے قبل کبھی اتنی سرعت سے تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں تھیں۔بیسویں صدی کا ذہن زندگی کی تبدیلیوں سے راست طور پر متاثر ہوا۔ ریڈیو، ٹیلی فون،موٹر کار، ہوائی جہاز، راکٹ، ٹیلی ویژن، سنیما،موبائل، جنگی ہتھیار اور دوسری تمام ایجادوں نے نہ صرف لوگوں کے عادات و اطوار کو تبدیل کر دیا تھا بلکہ اب لوگوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ زندگی کی تبدیلیوں سے غافل رہ سکیں۔

عالمی سطح پر بیسویں صدی نفسانفسی، اقتصادی اور روحانی بحران اور سیاسی تشدد کی صدی بھی تھی۔اس صدی میں علمی ترقی کی رفتار ہولناک حد تک تیز رہی ہے۔ یہ ایسی صدی تھی کہ جس میں انسان کی حکمرانی بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی تھی اور مشینوں کی عملداری بڑھ رہی تھی۔اخلاقیات، روحانیت اور مادہ پرستی میں جدلیاتی کیفیت تھی۔متحارب اور متضاد نظریے اور گروہ اس صدی کا خاصہ تھے۔ایک طرف مادہ پرستی اور تعقل کا زور تھا تو دوسری طرف روحانیت اور عقل بیزاری کا بھی چرچا تھا۔ایک طرف سائنس اور تکنالوجی نے انسان کے لیے محیر العقول کارنامے سرانجام دیے تھے تو دوسری طرف مشینوں کی وجہ سے حکومت سے بیزاری اور نفرت کا احساس بھی اتنی ہی شدت سے ہو رہا تھا۔

بیسویں صدی میں سیاسی، سماجی، اخلاقی، تہذیبی، تعلیمی اور ذہنی شعور میں بہت سی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔بیسویں صدی میں قدیم و جدید کی آویزش، نئے و پرانے خیالات کا ٹکراؤ، مشرقی و مغربی علوم کا حصول، انگریزی ادب اور افکار و خیالات کا آنا، سائنسی و صنعتی معاشرے کا قیام، قومی آزادی کی لہر، قومیت کا شعور، غلامی کی زنجیروں سے آزادی کا شدید احساس ایسی باتیں تھیں جنھوں نے ہندوستان کے پورے سماج کو بدل ڈالا۔اس دور کا انسان نہ صرف ملکی سطح کے مسائل سے آگاہ تھا بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے بھی بے خبر نہ تھا۔

بیسویں صدی سے قبل ہی ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت مضبوط ہو چکی تھی اور دوسری طرف اس صدی میں انگریزوں کے تسلط سے مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے ایک سیاسی شعور بھی بیدار ہو رہا تھا اور ساتھ ہی نئے سماجی اور معاشی مسائل بھی سر ابھار رہے تھے۔نئی اقتصادی کشمکش نے پرانے معاشرتی نظام کو متزلزل کر دیا تھا۔صدیوں پرانے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی جگہ ایک نیا سرمایہ دارانہ نظام سر ابھار رہا تھا۔جس کے نتیجے میں سماج میں نئے طبقے کا ظہور ہو رہا تھا۔ رسوم و قیوم کی پابندیوں اور جھوٹے رکھ رکھاؤ کے رجحانات نے سماجی زندگی میں بے

چینیاں پیدا کر دی تھیں۔ مذہب کی گرفت رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جارہی تھی اور مغرب پرستی کا رجحان دن بہ دن بڑھتا جارہا تھا۔لیکن لوگوں کے ذہنوں میں مغرب کی لائی ہوئی مادیت اور ہندوستان کی قدیم رومانیت کے درمیان جنگ برابر جاری تھی۔غرض اس عہد کا سماج متضاد اور متصادم خیالات و نظریات، بے چینی اور انتشار سے پر تھی۔ان حالات میں سماج بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب کہ ہندوستان میں عہد قدیم سے ہی مشترکہ سماج کی روایت رہی ہے لیکن جدید تعلیم ،مغربی اثرات، بدلتے ہوئے اقتصادی حالات اور مادہ پرستانہ ذہنیت کی وجہ سے اس قدیم روایت کو کافی دھکا لگا۔یہی وہ سماجی درد تھا جس کا ذکر ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں جگہ جگہ کیا ہے۔

سماج کے بدلتے حالات کا بغور جائزہ لیں تو ہندوستان کی تاریخ میں موجودہ صدی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔اس صدی کا آغاز متعدد معاشی اور ذہنی تبدیلیوں یعنی سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی تحریکوں سے ہوا۔ساتھ ہی انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد بھی تیز ہوئی۔عوام نے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھانا شروع کیا۔سماجی طور پر جو افراتفری مچی ہوئی تھی اس کے خلاف لوگ جمع ہوئے۔عوام میں سماجی اور معاشی بیداری آئی۔جدید تعلیم کے عام ہونے اور جدید صنعتوں کے قیام کے باعث صنعتی شہروں کے بننے کی وجہ سے مختلف شعبۂ زندگی کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آئے۔ یہ وہ چند اہم تبدیلیاں ہیں جن کی وجہ سے عوام کی زندگی متاثر ہوئی،لوگوں نے اپنے ملک کے علاوہ دور دراز کے ممالک کے مسائل اور وہاں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی سوچنا شروع کیا اور اس طرح عوام میں ذہنی وسعت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامیت کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔لیکن دوسری طرف اس صدی میں نئے نئے سماجی اور معاشی مسائل بھی پیدا ہوئے۔گاؤں کی اکائی کمزور ہوئی۔ وہاں کا نظام درہم برہم ہوا۔ دیہی صنعتوں کا زوال تیزی سے شروع ہوا اور ان پر انحصار کرنے والے معاشی بحران میں مبتلا ہو گئے۔کاشت کاروں کی زندگی سے سکون واطمینان غائب ہو گیا۔نتیجتاً لوگوں نے مشینی صنعت کے مرکزوں کی جانب روزگار کی تلاش میں رخ کیا جہاں اچانک آبادی بڑھنے،مختلف الخیال لوگوں کے جمع ہونے اور کام کے طور طریقوں میں تبدیلی کے سبب اور نئی جگہوں کی تہذیبی قدروں میں فرق ہونے کے باعث لوگوں کو نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ادب میں ان تبدیلیوں کی عکاسی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ناول تو ان تبدیلیوں کے تانے بانے سے مل کر ہی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ پریم چند کا دور انہی تبدیلیوں کا دور تھا۔وہ اپنی

آنکھوں سے بدلتی ہوئی حالت کو دیکھ رہے تھے۔ان کے ہم عصروں کی بھی ان تبدیلیوں پر گہری نظر تھی۔ اس کے بعد تو تبدیلیوں کا دور شروع ہوگیا۔ ہندوستان کو آزادی ملی لیکن ساتھ ہی تقسیم جیسے سانحہ سے بھی گزرنا پڑا۔جس کی پاداشت میں ملک میں بہت زیادہ خون خرابے ہوئے۔جان و مال کا کافی نقصان ہوا، وہ خواب جو ہندوستانیوں نے دیکھا تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات ملنے کے بعد ہم امن وسکون سے ملک میں رہ سکیں گے اور یہ ملک خوشحال ہوجائے گا افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔اس تباہ کاری اور دیگر ابھرنے والے مسائل کا درد بعد کے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں خوب ذکر کیا ہے۔

پریم چند ایک ایسے فکشن نگار تھے جنہوں نے فکشن کو رومانی دنیا سے حقیقی دنیا میں لا کھڑا کیا۔اپنی کہانوں میں ایسے موضوعات کو اپنایا جن کا تعلق ان کے قرب جوار کے لوگوں اور سماج سے تھا۔انھوں نے سماج کے پس ماندہ لوگوں کو جینے کا ہنر سکھایا۔انھیں اپنے حقوق سے واقف کرایا۔ اور یہ نعرہ بھی دیا کہ ہمیں اب حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔انھوں نے صرف نعرہ نہیں دیا بلکہ اپنی کہانوں کے ذریعہ اسے سچ بھی ثابت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانویوں میں ہمیں بیسویں صدی کے ابتدائی ہندوستان کی مکمل عکاسی دکھائی دیتی ہے جس کا اعتراف پروفیسر قمر رئیس نے بھی کیا ہے:

> پریم چند نے اردو ادب اور اس کے سرمائۂ فکر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔انھوں نے زندگی اور کائنات کو فکر و نظر کے مروجہ زایوں سے ہٹ کر ایک نئی سطح سے دیکھا۔ایک ایسی بلند سطح سے جہاں سے زندگی اور انسانیت کا سمندر کروٹیں لیتا اور ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ وہ پہلے ادیب ہیں جن کی نظر حالت انسانی کے اس انبوہ میں ان مجبور اور مقہور انسانوں تک پہنچی جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انھیں زبان دی۔ازلی پسپائی اور پس ماندگی کے شکار یہ ہندوستان کے دبے، کچلے کڑوروں انسان تھے۔ جو ملک کی غالب اکثریت اور اس کی دولت، تہذیب اور شان وشوکت کے خالق تھے۔"(۱)

پریم چند اردو اور ہندی کے بہترین ناول نویس اور افسانہ نگار تھے۔آپ کی شہرت اور مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ نے ہندی اور اردو ادب میں ایک انقلاب برپا کردیا۔آپ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ نے ہندوستانی ادب کو شہری زندگی سے نکال کر گاؤں کی زندگی سے اس طرح

جوڑ دیا کہ گاؤں کا پورا ماحول، رسم ورواج، غربت وافلاس، طور طریقے، عقائد ونظریات اور پورا گاؤں کے سماج کا کلچر اپنی اصل شکل وصورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ آپ کی تحریروں سے گاؤں کے رہنے والے بے کس و بے بس غریبوں کی حمایت کا اظہار ہوتا ہے۔

پریم چند اور ان کے ہم عصر ناول نگاروں کے ناولوں میں اس عہد کے سماجی مسائل، مٹتی ہوئی تہذیب کے نقوش، زمیندارانہ نظام کی قباحتیں، جاگیردارانہ ذہنیت سے پیدا شدہ مسائل، برہمنوں کی لوٹ کھسوٹ، مذہبی ظاہرداریوں کی ٹوٹتی ہوئی زنجیریں ہندوستانی سماج میں در آئی ہوئی بیماریاں، بیوہ کی کسمپرسی، طبقاتی کشمکش، مزدوروں اور کسانوں کی حالت زار، مہاجن کے خلاف دیہات والوں کا غصہ اور لوگوں کا گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت وغیرہ موضوعات کی عکاسی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے دور کے مسئلوں کو بے نقاب کر کے اسے حل کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ جس زمانے میں بیوہ کی دوبارہ شادی کا مسئلہ سماج میں تھا پریم چند نے 'بازارِ حسن' لکھ کر عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا۔ اس میں بے جوڑ شادی، طوائفوں کے مسائل اور جہیز کی لعنت پر بھی نکتہ چینی کی اور جاگیردارانہ ذہنیت کو بے نقاب کیا۔ چوگان ہستی اور گوشہ عافیت جو اس عہد کا المیہ ہے جس میں زمینداروں کا جبر، سرکاری افسروں کی لوٹ کھسوٹ اور کسانوں کی بغاوت، لگان کی وصولیابی کے لیے مال واسباب کی نیلامی، انگریزی سامراج اور سامراج کے پیدا کردہ جاگیرداروں اور زمینداروں کے مظالم کو بے نقاب کر کے ہندوستانی کاشتکاروں کو سامراج کے خلاف صف آراء کر دیا۔ میدان عمل لکھ کر لگان بندی اور اچھوت کے مرض کی نشاندہی کی۔ عورتوں کے لیے آشرم اور مفت تعلیمی انتظام کی بات اٹھائی اور جنگ آزادی کی جدوجہد کی حوصلہ افزائی کی۔ پریم چند کے ہم عصروں نے کم وبیش انہیں مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ اس دور کے سماج پر صنعت کاری اور تعلیم کا ہی اثر تھا کی گاؤں کا عام طبقہ زمیندار اور جاگیردار کے خلاف صف آراء ہونا شروع ہوتا ہے اور ان خلاف بغاوت کی چنگاریاں اٹھنے لگتی ہیں۔ گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت بھی دراصل اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اس دور میں برطانوی حکومت کے خلاف ملک میں بغاوت کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بغاوت آزادی کی تحریک کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ پورے ملک میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ افراد اس تحریک کی رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں۔ ملک کے عام طبقے میں آزادی کا جو تصور ابھرتا ہے وہ صرف برطانوی حکومت کے خلاف نہیں ہوتا ہے بلکہ زمیندار اور جاگیردار

طبقے کے خلاف بھی ہوتا ہے۔اب ملک کا عام طبقہ ان کے ظلم واستحصال کو برداشت کرنا گوارہ نہیں کرتا ہے بلکہ ان کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عام طبقے کے سامنے زمینداراور جاگیردار طبقے کی غلامی کرنے کے بجائے صنعتی نظام متبادل کے طور پر وجود میں آچکا ہوتا ہے۔اس دور کے ناولوں میں جاگیرداراور زمیندار طبقے کے خلاف جو بغاوت دکھائی دیتی ہے دراصل وہ تعلیم اور صنعت کے اثرات کی ہی دین ہے۔پریم چند نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے مسائل کو بھی بخوبی اٹھایا۔چونکہ وہ اسی ہندوستانی سماج کا حصہ ہے اسی لیے اس آدھی آبادی کو سرے سے نظر انداز کرنا پریم چند جیسے لکھنے والوں کے لیے مناسب نہیں تھا،انہوں نے عورتوں کے مسائل کو اپنے ناولوں میں اہمیت دی۔

سماج کو سب سے پہلے بیدار کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے ایسی صورت میں پریم چند اور ان کے ہم عصروں نے تعلیم کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔نذیر احمد نے بھی اپنے سب سے پہلے ناولوں میں تعلیم کو ہی اہمیت دی تھی۔پریم چند کے عہد میں تعلیم کا رواج بہت کم تھا۔لڑکے اور لڑکیاں تعلیم کی کمی کے باعث خانگی زندگی کو کامیابی سے نہیں بسر کرپاتے تھے۔اس لیے پریم چند نے نوجوان طبقے کو شادی سے قبل مناسب تعلیم حاصل کرنے پر زیادہ زور دیا ہے۔کیوں کہ پریم چند تعلیم نسواں کی اہمیت اور افادیت سے اچھی طرح واقف تھے۔وہ عورتوں کی ابتر حالت میں تبدیلی کے خواہش مند تھے کہ عورتوں کی اس مجبوری اور بے بسی کی اصل وجہ تعلیم کی کمی ہے۔عورتیں اگر تعلیم سے آشنا ہوجائیں تو وہ خود بخود اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں،ناانصافیوں اور ظلم وستم کا سامنا کرسکتی ہیں۔اپنے حقوق کے لیے جنگ لڑسکتی ہیں۔ملک اور قوم کی ترقی میں مردوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے چل سکتی ہیں انہوں نے ناول 'غبن' میں رما ناتھ اور وکیل صاحب کی گفتگو کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم کی وکالت کی ہے:

> ''جب تک عورتوں کی تعلیم کا رواج نہ ہوگا ملکی ترقی غیر ممکن ہے۔آپ تو یورپ نہ گئے ہونگے۔واہ! کیا آزادی ہے۔کیا دولت ہے۔کیا زندگی ہے۔کیا جوش ہے۔بس معلوم ہوتا ہے کہ یہی جنت ہے اور عورتیں بھی سچ مچ دیویاں ہیں۔کتنی خوش مزاج اتنی آزاد یہ سب عورتوں کی تعلیم کی برکت ہے۔''(۲)

لیکن پریم چند کے اکثر ناولوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ عورتوں کو خاتون خانہ کی حیثیت سے ہی اہمیت دیتے ہیں بلکہ ان کی نظر میں تعلیم نسواں کی عطا کردہ آزادی بھی معیوب ہے۔ڈاکٹر گیتا لال کا خیال ہے کہ:

''جدید تعلیم یافتہ عورتوں کی انہوں نے وہیں مخالفت کی ہے، جہاں وہ نوکری کرنے، آزاد اور عشرت انگیز زندگی بسر کرنے اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں ہی اپنی خاتونیت کا معراج سمجھتی ہیں۔'' (۳)

پریم چند عورت کو بہتر تعلیم اور تربیت دینے کے حامی ضرور تھے لیکن اس کا مقصد صرف خانہ داری اور گھریلو زندگی کو خوش حال بنانے تک محدود تھا۔ وہ عورتوں کی ملازمت اختیار کرنے کے سخت مخالف تھے۔

ناول 'گوشہ عافیت' میں تعلیم کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کا کردار پریم شنکر اعلی تعلیم یافتہ ہے جس کی وجہ سے اس کی سوچ میں وسعت اور پختگی آجاتی ہے۔ وہ چھوٹے بڑے امیر غریب کے فرق کو بالائے طاق رکھتا ہے۔ سب کو مساویانہ حقوق دلانے کے لیے کاربند نظر آتا ہے۔ قوم کی بہتری کا جذبہ اور سماج کی ترقی اس کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ وہ گاؤں گاؤں جا کر وہاں کے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ ساری زندگی کسانوں کی بھلائی اور مدد کے لیے وقف کر دیتا ہے۔

پریم چند ایک مثالی عورت کے لیے تعلیم و تربیت سے آراستہ ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے ایک طرف عورتوں کا اخلاق اور ان کی سیرت بہتر ہوتی ہے تو دوسری طرف وہ ان فرسودہ رسوم و رواج سے گریز کر سکتی ہے۔ 'نرملا' ناول میں کردار سدھا کا اپنے بچے سے ہاتھ دھو بیٹھنا اسی غلط رسوم و رواج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن پریم چند نے جہاں تعلیم کو ضروری قرار دیا ہے وہاں انہوں نے تعلیم کا دائرہ گھر کی چہار دیواری تک ہی محدود کر دیا۔ وہ تعلیم سے مراد مغرب پرستی یا مغربی روایات کی پاسداری اور اندھا دھند تقلید کو نہیں لیتے ہیں بلکہ وہ ان اوصاف کو اپنانے پر زور دیتے ہیں جس سے عورتوں کی تربیت ہو اور انہیں گھر اور معاشرے کی بہتر رکن بنا سکیں۔ اپنے شوہروں کے ساتھ بہتر طور پر نباہ کر سکیں۔ وہ جدید تعلیم، روایات اور مغرب پرستی کے اس چلن سے سخت نالاں اور مخالف تھے جو عورتوں کو گھر سے بیگانہ کر دے۔ ان کے نزدیک عورت کی جگہ گھر میں تھی۔ پریم چند تعلیم یافتہ مغرب زدہ عورتوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے افسوس ہے کہ ہماری بہنیں مغرب کی بات لے رہی ہیں۔ جہاں عورتوں نے اپنا مرتبہ کھو دیا اور مالک کے درجے سے گر کر شوق و پسند کی چیز بن گئی ہیں۔ مغرب کی عورت آزاد ہونا چاہتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ عیش کر سکے۔ ہماری ماؤں کا یہ

معیار کبھی نہیں رہا۔ انہوں نے ہمیشہ خدمت کے حقوق سے گرہستی چلائی ہے۔ مغرب میں جو چیزیں عمدہ ہیں وہ ان سے لے لیجیے۔ تمدن میں ہمیشہ لین دین ہوتا آیا ہے مگر کورانہ تقلید تو دماغی کمزوری ہی کی علامت ہے۔ مغرب کی عورت آج گھر کی مالکہ بن کر نہیں رہنا چاہتی۔ عیش وعشرت کی زبردست خواہش نے اسے بالکل آزاد بنادیا ہے۔ اس نے اپنی شرم اور بزرگی کو جو اس کی سب سے بڑی پونجی تھی، شوخی اور تفریح پسندی پر قربانی کردیا ہے۔ جب میں وہاں کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اپنی شکل یا اپنے بھرے ہوئے گول بازوؤں کی یا اپنی عریانی کی نمائش کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ ان کی خواہش نے انہیں اتنا مغلوب کردیا ہے کہ وہ اپنی لاج کا بچاؤ بھی نہیں کرسکتیں۔ عورت کی اس سے زیادہ کیا گراوٹ ہوسکتی ہے۔"(۴)

گئودان کی مس مالتی ایک ایسا ہی کردار ہے جس کے نزدیک اندھا دھند تقلید اور بے جا آزادی، مساوات یا حقوق نسواں کے مساوی ہے۔ ایسی عورت پر نہ تو طبقہ نسواں کو کوئی فخر ہے اور نہ ہی وہ ماں، بیٹی یا بیوی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری سے کما حقہ انصاف کرسکتی ہے۔ پریم چند کے نزدیک عورت ایک مقدس اور اعلیٰ ہستی تھی جس سے خدمت، ایثار اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری کی امید کی جاتی تھی۔ اس کا مقام گھر کی چہار دیواری کے اندر تھا۔ جہاں اس کو عزت اور وقار حاصل ہونا چاہیے اسے گھر سے بلاوجہ باہر نکل کر اپنی خودی اور وقار کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جدید تعلیم کو روزگار نہیں بلکہ اخلاقی حالت سنوارنے کے لیے استعمال کرنے کے حق میں تھے۔

آزادی سے قبل ہندوستانی سماج انگریزوں، زمین داروں، سرمایہ کاروں اور صنعت کاروں کا غلام تھا۔ جو بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ہندوستانی سماج ان کے ظلم وستم کا شکار ہورہا تھا۔ پریم چند اور ان کے معاصرین کا دور انہیں مسئلوں سے گزر رہا تھا۔ ان لوگوں نے ان مسئلوں سے سماج کو نبرآزما ہوتے بذات خود مشاہدہ کیا تھا بلکہ وہ اس کے اتار چڑھاؤ سے متاثر بھی رہے ہیں۔ ناول 'چوگان ہستی' میں پریم چند نے اپنے عہد کی زندگی کے دو اہم مسائل سرمایہ داری، صنعت کاری اور انگریزوں کے تسلط پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"(الف) سرمایہ داری کی لعنتوں اور صنعتی عہد کی آلودگیوں کا بڑھتا ہوا سیلاب جو شہر اور دیہات دونوں کے معاشی، معاشرتی اور اخلاقی معیاروں کو توڑتا ہوا تیزی سے

آگے بڑھ رہا ہے۔اس کی نمائندگی جان سیوک کرتا ہے۔اور پانڈے پور کی سرزمین جہاں سرمایہ دارانہ اور قدیم جاگیردارانہ قوتوں کے درمیان یہ تصادم واقع ہوتا ہے، سارے ہندوستان کی نمائندہ ہے۔" (ب) دیسی ریاستوں میں غیر ملکی سامراجی اقتدار کے زیر اثر غریب رعایا پر من مانے مظالم، انگریز ایجنٹوں اور دیوانوں کی تانا شاہی، راجاؤں کی عیش کوشی اور بے دست و پائی، عوام کا اضطراب، خوف و ہراس اور ظلم کے خلاف متحد ہو کر لڑنے کا باغیانہ رجحان پریم چند نے جسونت نگر کے دیوان سردار پٹیل کھنڈراؤ، مسٹر کلارک، داروغہ جیل اور ویرپال کرداروں کو لا کر ریستوں کے اندرونی خلفشار اور عوامی بے چینی کو بڑی کامیابی سے دکھایا ہے۔"(۵)

ناول 'چوگان ہستی' کا کردار سورداس بنارس کے پانڈے پور گاؤں کا باشندہ ہوتا ہے۔اسے وراثت میں کچھ غیر مزروعہ زمین حاصل ہوتی ہے جسے گاؤں والے چراگاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔شہر کا ایک دولت منداس زمین پر سگریٹ بنانے کا کارخانہ کھولنا چاہتا ہے۔لیکن سورداس اپنی موروثی زمین کو بیچنے کے لیے کسی بھی طرح تیار نہیں ہوتا ہے۔جان سیوک زمین حاصل کرنے کے لیے سورداس کو مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے:

"اس شدت کے کارخانے سے کم سے کم ایک ہزار آدمیوں کی زندگی کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور کھیتی کا بوجھ ان کے سر سے ٹل جائے گا۔۔۔جتنی زمین کو ایک آدمی اچھی طرح جوت بو سکتا ہے، اس میں گھر بھر کا لگا رہنا بیکار ہے۔۔۔میرا کارخانہ ایسے بیکاروں کو اپنی روٹی کمانے کا موقع دے گا۔"(۶)

جان سیوک گاؤں والوں کو بھی سمجھاتا ہے کہ کارخانہ کے قیام سے انہیں روزی روٹی حاصل کرنے کے لیے شہروں کی خاک نہیں چھاننی پڑے گی۔انہیں اس کارخانے میں آسانی سے ملازمت مل جائے گی۔گاؤں کے لوگ اس صنعتی انقلاب اور خوش آئند مستقبل کو سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔لیکن سورداس کسی بھی طرح کارخانہ کھولنے کے لیے زمین دینے کو راضی نہیں ہوتا ہے۔وہ شہروں کی خاک چھان چکا تھا اور یہ دیکھ چکا تھا کہ کارخانوں کے قیام کے ساتھ ساتھ شہروں میں گندی بستیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔اور طرح طرح کی پریشانیاں ہوتی ہیں۔جیسے جوا،

شراب،عیاشی، چوری اور مار پیٹ وغیرہ وہ شہروں کے اس صنعتی ماحول کو سوچ کر کانپ جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا ہے کہ گاؤں میں بھی یہ گندگی پھیلے۔ راجہ مہیند رکمار اسے سمجھاتے ہیں کہ اس کارخانے میں ہر کسان مزدور کو روزگار ملے گا اور لوگوں کو فائدہ حاصل ہوگا۔لیکن اس کے برعکس سورداس محسوس کرتا ہے کہ زمین بیچنے پر اسے اور گاؤں والوں کو فائدہ تو کم ملے گا اور نقصان زیادہ ہوگا۔ وہ راجہ مہندر پرتاپ سے نہایت صفائی اور برجستگی سے کہتا ہے:

''سرکار بہت ٹھیک کہتے ہیں۔ محلے کی رونق تو ضرور بڑھے گی۔ روزگار لوگوں کو فائدہ بھی خوب ہوگا لیکن جہاں یہ رونق ہوگی وہاں تاڑی سراب کا پرچار بھی بڑھے گا۔ کسبیاں بھی تو آ کر بس جائیں گے۔ دیہات کے کسان اپنا کام چھوڑ مجوری کے لالچ سے دوڑیں گے۔ یہاں بری باتیں سیکھیں گے۔۔۔ دیہاتوں کی بہوئیں مجوری کرنے آئیں گی اور یہاں پیسہ کے لوبھ میں اپنا دھرم بگاڑیں گی۔''(۷)

سورداس کا یہ خیال صرف ایک تصور ہی نہ تھا بلکہ جس عہد میں یہ ناول لکھا گیا اس عہد میں کارخانوں کے مالکان ہزاروں غریب کسانوں اور مزدوروں کو روزگار کا لالچ دے کر کارخانے میں اکٹھا کر لیتے تھے لیکن ان کی رہائش اور صحت کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔انہیں تنخواہ بھی بہت کم دی جاتی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں کو گاؤں میں چھوڑ کر کارخانے کے قرب جوار کے گندے علاقوں میں رہنے کو مجبور تھے۔ جہاں انہیں نہ تو اپنی برادری کا خوف ہوتا تھا اور نہ ہی کسی اپنے پرائے کا ڈر،اس کا نتیجہ ہوتا تھا کہ وہ طرح طرح کی سماجی اور اخلاقی برائیوں کے شکار ہو جاتے تھے۔ مادہ پرستانہ تہذیب وتمدن کے خراب نتائج پریم چند کی نگاہوں میں بھی تھا اسی لیے انہوں نے گاؤں میں صنعتوں اور کارخانوں کے قیام کی شدید مخالفت کی ہے۔

بہرحال جان سیوک نے قانون کا جھوٹا سہارا لے کر سورداس کی زمین پر قبضہ جمالیتا ہے۔ کارخانہ بنتے ہی مزدور بڑی تعداد میں جمع ہونے لگتے ہیں۔لیکن ان مزدوروں کی رہائش کا کارخانے کی طرف سے کوئی معقول انتظام نہیں کیا جاتا ہے۔نتیجتاً بہت سے مزدور پانڈے پور کی بستی میں ٹھکانہ تلاش کرنے لگتا ہے۔گاؤں والے بھی کرایہ کے لالچ میں اپنے گھر میں ٹھہرانے لگتے ہیں۔اس طرح کارخانے کے کتنے ہی مزدور پانڈے پور کی بستی میں رہنے لگے۔اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ گاؤں کے ہر محلے میں روزانہ ایک نہ ایک ہنگامہ کھڑا رہتا تھا۔ جدید صنعتی نظام کے قیام کے برے سماجی اثرات دکھائی دینے شروع ہوجاتے ہیں۔

سورداس کو صنعتوں کے قیام سے گاؤں میں اخلاقی کمزوریوں کے جڑ پکڑنے کا جو خوف تھا ویسا ہی ہوا۔ پانڈے پور کا نوجوان طبقہ بے راہ روی کا راستہ اختیار لیتا ہے۔ اور گاؤں میں اب وہ ساری برائیاں ہونے لگتی ہیں جس سے گاؤں پاک تھا۔ صنعت کاری کی وجہ سے جو برائیاں عام ہوتی ہیں اس کا اثر سماج پر بھی پڑتا ہے۔ ناول میں پریم چند نے ان واقعات کو پیش کر کے صنعتوں کے قیام سے پیدا ہونے والی اخلاقی و تہذیبی خرابیوں کی سورداس کے ذریعہ مخالفت کی ہے۔ اور صنعتوں کے قیام سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔

پریم چند کے 'گئودان' میں بھی صنعت کاری کی وجہ سے ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ دولت کی فراوانی مرد کو اندھا کر دیتی ہے۔ انسان عیاش، شرابی اور طوائف باز ہوجاتا ہے۔ روپیہ پیسہ کی زیادتی سے سماج میں باہمی رقابتیں اور رنجشیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ 'گئودان' میں چندر پرکاش کھنہ ایک دولت مند صنعت کار کے کردار میں ہے۔ دولت کی زیادتی نے ان کو عیاش اور بدکردار بنادیا ہے۔ قدم قدم پر بیوی کو برا بھلا کہنا، اس کی بے عزتی کرنا اور اس کی طرف سے بے توجہی برتنا ان کے خمیر میں داخل ہوگیا تھا۔ خوب سیرت اور خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے بھی کھنہ دوسری عورتوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ ناول چوگان ہستی میں جس سماج کو دیکھایا گیا ہے اس میں دولت اور مادی آسائش کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح میدان عمل میں لالہ دھنی رام کے سماج میں شہری زندگی کی وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو صنعت کاری کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔

ہندوستانی سماج میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے ہر ایک کا ظلم وستم برداشت کیا ہے۔ پریم چند اس طبقے کی آواز بن کر اس کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عورتوں کے مسائل کے نقطۂ نظر سے اگر پریم چند کے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں عورتوں کا درد زیادہ واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ان ناولوں میں عورتوں کی قابل رحم اور دردناک زندگی بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عورتوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کے خلاف ہر محاذ پر احتجاج ملتا ہے۔ ہندو مذہب اور سماج نے عورتوں کے ساتھ جو مظالم صدیوں سے روا رکھے تھے خاص طور سے بیوہ کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا اس کی

انتہائی مکروہ شکل نظر آتی ہے۔ دراصل پریم چند مساوات، انسانیت، شرافت اور انصاف کے قائل تھے۔ وہ سماج کے ہر طبقے کو زندگی کی جدوجہد میں برابر کا شریک کار دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ عورت پہلے خود کفیل بنے۔ کیونکہ جب تک عورت معاشی حیثیت سے مرد ذات کی محتاج رہے گی تب تک وہ دوسرے درجے کی مخلوق سمجھی جاتی رہے گی۔ ڈاکٹر شمیم نکہت یوں رقم طراز ہیں:

> ''پریم چند عورتوں اور مردوں کی برابری کے حق میں تھے۔ وہ گھریلو معاملات ہوں یا ملکی مسائل ان کی نگاہ میں اسی وقت حل کیے جاسکتے تھے جب دونوں اس کے لیے کوشش کریں اور اگر ان میں کسی کا مرتبہ کم یا زیادہ ہوگا تو ایک کی برتری دوسرے کے کام میں حارج ہوگی اور وہ سماج کی بے انصافیوں کے خلاف پورے طور پر ٹکر نہیں لے سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ ہریجن عورت پنڈتوں اور مہاجنوں کے ظلم و زیادتیوں سے متاثر ہوتی ہے اور ان مظالم و جبر کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ اسی طرح خانگی زندگی میں بھی وہ عورتوں اور مردوں کی برابری پر زور دیتے ہیں۔''(۸)

پریم چند کے ناولوں میں عورت کے تمام ناگفتہ حالات و کوائف کا نقشہ ملتا ہے۔ وہ شادی بیاہ کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ عورتوں کی آزادی رائے کے قائل نظر آتے ہیں بلکہ وہ اس بات کی شدید حمایت کرتے تھے کہ شادی سے قبل عورت اور مرد کو تبادلہ خیال کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ ان کے نزدیک شادی ایک معاہدہ ہے جس کی کامیابی کا انحصار فریقین کی رضامندی پر منحصر ہے۔

پریم چند کے ابتدائی ناول زیادہ تر گھریلو زندگی کے مسائل یعنی بیوہ، طوائف، تعلیم اور تعدد ازدواج وغیرہ کے مسئلے پر مبنی تھا اور اس میں اصلاح کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے ناولوں میں انہوں نے عورت کو ایک سیاسی اور سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی فعال دکھایا ہے۔ ان سے قبل کسی میں بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ عورتوں کو پسماندگی سے نکالنے کی کوشش کرے اور انہیں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کرے۔ پریم چند کے ناولوں میں ''چوگان ہستی''، ''غبن'' اور ''میدان عمل'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن میں عورتوں کے احساس و جذبات پوری طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

ناول ''بیوہ'' میں پورنا کا کردار اس مظلوم طبقے کی الم نصیبی کو بیان کرتا ہے جس پر ہندو سوسائٹی

کے ظلم و جبر کی ایک طویل داستان ہے۔اس معاشرے میں بیوہ کے لیے کوئی محفوظ مقام نہیں تھا، وہ کسی کے رحم اور ہمدردی کے مستحق بھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بیوہ کی پامالی کا ذکر اس اقتباس میں دیکھیں۔

''بیوہ پر الزام لگا دینا کتنا آسان ہے۔عوام کو اس کے بارے میں برے سے برا خیال کرتے دیر نہیں لگتی۔ گویا کج روی ہی بیوگی کی قدرتی معاش ہے۔ گویا بیوہ ہوجانا دل کی ساری خواہشات اور کمزوریوں کا اڈ پڑنا ہے۔''(۹)

اس ناول کے ذریعہ بیوہ کی دوسری شادی کی وکالت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جب مرد اپنی بیوی کی موت کے بعد دوسری شادی کر سکتا ہے تو بیوہ عورت کیوں نہیں کر سکتی۔اور اگر بیوہ عورت خود شادی نہیں کرنا چاہتی ہے تو اسے سماج میں باعزت زندگی گزارنے دینا چاہیے۔

ناول ''بیوہ'' کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ایک عورت کے درد کو بیان کیا گیا ہے۔جس سے سماج میں عورت کی حیثیت پوری طرح ظاہر ہورہی ہے۔ناول ''بیوہ'' کا کردار سمترا اس سلسلے میں طنز آمیز جملہ کہتی ہے۔ملاحظہ ہو:

''عورت مرد کے پیروں کی جوتی کے سوا ہے ہی کیا، مرد چاہے جیسا ہو، چور ہو، بدکار ہو، شرابی ہو، عورت کا فرض ہے کہ اس کے پیر دھو کر پیئے۔''(۱۰)

ناول ''غبن'' میں ہندوستانی سماج میں بیوہ کا اپنے شوہر کی جائیداد میں حق کی حمایت میں پرزور وکالت ملتی ہے۔ پریم چند ناول غبن کا کردار رتن کی زبانی اس مذموم رسم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''نہ جانے کس پاپی نے یہ قانون بنایا تھا۔اگر ایشور کہیں ہے اور اس کے یہاں انصاف ہوتا ہے تو ایک دن اس کے سامنے اس پاپی سے پوچھوں گی کیا تیرے گھر میں ماں بہن نہ تھیں، تجھے اس کی توہین کرتے شرم نہ آئی اگر میری زبان میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس کی آواز سارے ملک میں پہنچ سکتی تو میں اپنی بہنوں سے کہتی۔بہنوں مشترکہ خاندان میں شادی مت کرنا اور اگر کرنا تو جب تک اپنا گھر الگ نہ بنا لینا آرام کی نیند مت سونا، خاندان تمہارے لیے پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے۔''(۱۱)

عورتوں کو اقتصادی طور پر مضبوط کرنے کے لیے پریم چند ''بازار حسن'' میں تعلیم نسوں

اور آزادی نسواں کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب تک عورتوں کو اقتصادی طور پر مجبور و محکوم سمجھا جاتا رہے گا سماج میں عورتوں کے حوالے سے کئی خطرناک نتائج سامنے آتے رہیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ لڑکیوں کے والدین صحیح تعلیم و تربیت دیں تا کہ وہ سماج میں مردوں کے دوش بدوش شانہ بہ شانہ ملا کر چل سکے۔ باز ارحسن کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم اپنی خانگی زندگی کی طرف سے کتنے بے فکر ہیں اس کے لیے کسی تیاری یا تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھتے، گڑیاں کھیلنے والی لڑکی، سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے والی دوشیزہ گھر کی مالک بننے کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ الھڑ بچھڑے کے کندھے پر بھاری جوا رکھ دیا جاتا ہے ایسی حالت میں اگر ہماری معاشرتی زندگی مسرت آمیز نہ ہو تو کوئی تعجب نہیں۔''(۱۲)

عورتوں کے ذریعہ مرد کی اطاعت شعاری کو جہاں بہتر سمجھا گیا ہے وہیں ناول ''میدان عمل'' میں کردار سکھدا کے ذریعہ یہ کہلوایا گیا ہے کہ شوہر کی اطاعت بیوی کا اولین فرض ہے لیکن اگر وہ بیوی کی توہین کرتا ہے تو اس کے ناجائز اقتدار سے بغاوت کرنے کا اسے پورا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اب عورت خاموش بیٹھ کر رہنا نہیں چاہتی بلکہ صحیح اور غلط کا فیصلہ وہ خود اپنے طور پر لینا چاہتی ہے۔

''اب کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ شوہر چاہے جو کچھ کرے اس کی عورت اس کے پانو ڈھوڈھو کر پیئے گی۔ اسے اپنا مالک سمجھے گی۔۔۔ وہ دن لد گئے۔''(۱۳)

اسی طرح ناول ''گئو دان'' میں ایک دیہاتی عورت دھنیا کا کردار دیہات میں پسماندہ عورت پر ظلم و جبر کے خلاف حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ دھنیا کے دل میں ان مذہبی اور سماج کے ٹھیکیداروں کی کوئی وقعت نہیں جو مذہبی اور معاشرتی رسوم کا ڈھنگ اسی لیے رچاتے ہیں کہ غریبوں کو لوٹ کر اپنے گھر میں ذخیرہ اندوزی کر سکیں۔ اس لیے دھنیا یہ کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے:

''یہ پنچ نہیں ہیں راکھشس ہیں، پکے اور پورے راکھشس یہ سب ہماری جگہ چھین کر مال مارنا چاہتے ہیں۔ ڈنڈا باندھ کر تو بہانہ ہے۔۔۔ تم ان راکھشس سے دیا کا آسرا رکھتے ہو۔''(۱۴)

پریم چند کے ناولوں میں ہندوستانی سماج کے تمام مسائل نظر آتے ہیں، خاص طور سے گاؤں میں رہنے والے لوگوں اس میں بھی عورتوں کے مسائل کو خوب شد و مد سے اٹھایا ہے، بلکہ جگہ جگہ وہ اس کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حواشی:

(۱)۔ پریم چند کی روایت اور معاصر اردو فکشن، قمر رئیس، ایوان اردو، دہلی، نومبر ۲۰۰۶ء، صفحہ ۵

(۲) مدن گوپال مرتبہ، غبن، کلیات پریم چند جلد 6، قومی کونسل، دہلی، 2000 ص۔ 257-258

(۳) گیتالال، پریم چند کا ناری چترن، ص۔ 412

(۴) پریم چند، نرملا، ص۔ 197

(۵) پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ڈاکٹر قمر رئیس، سرسید بک ڈپو علی گڑھ، 1977 ص۔ 242

(۶) پریم چند، چوگان ہستی، جلد اول، ص۔ 46

(۷) پریم چند، چوگان ہستی، جلد اول، ص۔ 145

(۸) شمیم نکہت، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص۔ 288

(۹) پریم چند، بیوہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1961، ص۔ 65

(۱۰) پریم چند، بیوہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1961، ص۔ 67

(۱۱) پریم چند، غبن، اردو بازار دہلی، 1961، ص۔ 30

(۱۲) پریم چند، بازار حسن، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص۔ 31

(۱۳) پریم چند، میدان عمل، ص۔ 333

(۱۴) پریم چند، گئو دان، ص۔ 213